بسم اللہ الرحمن الرحیم

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلاَةُ وَالسَّلاَمُ عَلَى خَاتَمِ الأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ،

أَمَّا بَعْدُ:

38- اللہ تعالٰی کی صفات کمال میں سے چار صفات: الغضب، السخط، الکراھیۃ، البغض- حصہ سوم

العقیدۃ الواسطیۃ لشیخ الاسلام الامام ابوالعباس احمد ابن تیمیہ رحمہ اللہ، شرح فضیلۃ الشیخ العلامہ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ، اور ہم بات کر رہے تھے اللہ تعالٰی کے اسماء وصفات کے تعلق سے اور جہاں پر رُکے تھے وہیں سے درس کا آغاز کرتے ہیں۔

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

4-"الآیۃ الرابعۃ": چوتھی آیت جو ہے اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے: ﴿وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ﴾ إلي آخر الآیۃ (التوبہ: 46)۔ شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے مراد منافقین ہیں جو اللہ تعالٰی کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جہاد میں نہیں نکلے کیونکہ اللہ تعالٰی نے اُن کا نکلنا ناپسند کیا تھا کیونکہ اُن کا عمل اخلاص پر مبنی نہیں تھا، اور اللہ تعالٰی شرک اور شرک کرنے والوں سے بے پرواہ ہے۔

اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ جہاد میں نکلتے مومنوں کے ساتھ تو وہ خود بھی پست ہوتے اور مومنوں کو بھی پست کر دیتے اور فتنے کا باعث بنتے جیسا کہ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے: ﴿لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ﴾ إلي آخر الآیۃ (التوبہ: 47)۔

شیخ صاحب (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں: جب وہ مخلص نہیں ہیں اور فساد کرنے والے ہیں تو بے شک اللہ تعالٰی فساد کو ناپسند کرتا ہے اور شرک کو بھی ناپسند کرتا ہے، تو بس نتیجہ یہی نکلا: "ف ﴿كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ﴾، یعني: جعل هممهم فاترة عن الخروج للجهاد"، یعنی اللہ تعالٰی نے اُن کی ہمتوں کو پست کر دیا کہ وہ جہاد میں اللہ تعالٰی کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہ نکل سکیں۔

اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ﴾ (اور یہ کہا گیا کہ تم بیٹھو بیٹھنے والوں کے ساتھ) (التوبہ: 46)۔ یعنی جو جہاد میں پیچھے رہ گئے ہیں (یا جہاد سے پیچھے رہ گئے ہیں) اُن کے ساتھ بیٹھے رہو۔

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہو یعنی ﴿قِيلَ﴾ (کہا گیا) کس نے کہا ہے: پہلا احتمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہو اور یہ کونی حکم ہے اللہ تعالیٰ کا ''کونا''، اور یہ بھی احتمال ہے کہ اُن میں سے بعض ایک دوسرے سے کہتے رہتے ہیں کہ تم بھی بیٹھ جاؤ بیٹھنے والوں کے ساتھ، کیونکہ جہاد سے بعض ایسے لوگ بھی تھے جو پیچھے رہ جاتے تھے جو اہل الأعذار ہیں کہ فلاں بھی نہیں نکلا فلاں بھی نہیں نکلا جہاد کے لیے جیسا کہ مریض ہے (بیمار)، یا اندھا ہے، یا لنگڑا وغیرہ جو ہے جنہیں اہل الأعذار کہا جاتا ہے وہ جہاد میں شریک نہیں ہوا کرتے تھے اپنے عذر کی وجہ سے۔

منافقین بھی جہاد کے لیے نہیں نکلتے تھے اُن کے پاس کوئی عذر نہیں ہوتا تھا سوائے یہ کہ مخلص نہیں تھے اخلاص نہیں تھا وہ بھی پیچھے رہ جاتے تھے) تو اُن کو یہ کہا گیا کہ تم بیٹھ جاؤ یعنی جہاد سے پیچھے رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ بیٹھنے والے کون ہیں؟ یہ اہل الأعذار ہیں۔ تو احتمال کیا ہے کس کا فرمان ہے یہ ﴿وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ﴾؟ تو شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ دو احتمالات ہیں اس کے:

(۱) پہلا احتمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کا یہ حکم ہے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ تم بیٹھو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ تو یہ حکم کون سا ہو گا؟ حکم کونی ہے شرعی نہیں ہے (کونی وقدری جسے کہتے ہیں) ''کونا''۔

(۲) اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کہتے کہ تم بھی بیٹھ جاؤ فلاں بھی تو بیٹھا ہے نا وہ بھی تو نہیں گیا چلو تم بھی نہ جاؤ (وہ ایک دوسرے کو کہتے کہ تم بھی نہ جاؤ فلاں بھی تو نہیں گیا)، یہ "فلاں" اہل الأعذار میں سے تھا اُس کے پاس عذر ہے)۔ بیمار ہے، یا اندھا ہے، یا لنگڑا ہے، یا کوئی بھی اُس کے پاس عذر شرعی ہے وہ نہیں جا سکتا تو تمہارے پاس کیا عذر شرعی ہے؟! تو ﴿وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ﴾ میں دونوں احتمالات موجود ہیں۔

اور یہ بھی کہتے منافقین جو ہیں جب پیچھے رہ جاتے جہاد کے: "اور جب اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس آئیں گے جہاد سے تو ہم اپنا عذر پیش کریں گے اُن کے سامنے رکھیں گے اپنا عذر جو ہے (جبکہ عذر کوئی نہیں تھا اُن

کے پاس) تو جھوٹ بول کر کوئی اپنا عذر ہم پیش کر دیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو ہیں ہمارے لیے استغفار کر لیں گے اللہ تعالیٰ سے اور ہمارے لیے وہی کافی ہو گا۔

پھر شیخ صاحب (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ) فرماتے ہیں: اور یہ ممکن ہے کہ دونوں قول کو جمع کیا جائے۔

یہ دیکھیں پیاری ایک علمی بات دیکھیں آپ: اب ﴿قِيلَ﴾ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہو سکتا ہے احتمال ہے، اور منافقین کا ایک دوسرے کو کہنا بھی ہو سکتا ہے۔ کیا جمع کیا جا سکتا ہے دونوں کو؟ اور قاعدہ کیا ہے قرآن کی تفسیر میں؟ جب دونوں احتمالات ہوں کوئی کنٹراڈکشن (Contradiction) نہ ہو اور دونوں کا امکان ہو تو دونوں معنی لیے جاتے ہیں ہمیشہ، معنی مزید وسیع ہو جاتا ہے اور اس کا اثر بھی مزید گہرا ہوتا ہے دلوں پر۔

تو جمع کیا جا سکتا ہے کیونکہ جب اُن کو یہ کہا جائے "کہ تم بیٹھو بیٹھنے والوں کے ساتھ" اور وہ بیٹھ گئے ایک دوسرے کو کہہ کر تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی تقدیر میں پہلے سے لکھا ہوا کہ نہیں؟ "کونا" پہلے اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے پہلے سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تو دونوں بھی کیا جا سکتا ہے۔

اور اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی صفت جو ہے کون سی صفت ثابت ہے اس میں؟ ناپسند کرنا۔ الكُرْه جو ہے (ناپسند کرنا)، اور یہ صفت جو ہے ثابت ہے کتاب اور سنت میں شیخ صاحب فرماتے ہیں، اور دلائل بھی دیکھ لیں اللہ تعالیٰ کی اس صفت کمال کے، یہ بھی صفت کمال میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا...﴾ ، إلى قوله: ﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا﴾ (الاسراء: 23-38)"۔

اب شاہد کہاں پر ہے؟ ﴿مَكْرُوْهًا﴾۔ یہ جتنی بھی نافرمانیاں جن کا ذکر ہوا ہے ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک لفظ سے ان کا اختتام کیا ہے ﴿مَكْرُوْهًا﴾ کہ اللہ تعالیٰ کو یہ تمام چیزیں ناپسند ہیں۔

اور دوسری دلیل یہی آیت جو سورۃ التوبہ کی آیت نمبر 46 ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ﴾: تو ﴿كَرِهَ اللّٰهُ﴾ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ ناپسند کرنا۔

اور سنت میں سے صحیح حدیث میں سے اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''إِنَّ اللهَ كَرِهَ لَكُمْ قِيلَ وَقَالَ'' (لمبی حدیث ہے اُس میں سے شاہد صرف یہ ہے) کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ناپسند کرتا ہے) ''قِيلَ وَقَالَ'' (کثرت سے باتیں کرنا (جو بے سود باتیں ہوتی ہیں بے معنی باتیں ہوتی ہیں، یا بے فائدہ کچھ جو باتیں ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ناپسند کرتا ہے))۔

''فالكراهة ثابتة بالكتاب والسنة، أن الله تعالىٰ يكره'' (تو کتاب اور سنت سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے)۔

اب دوسری بات اس صفت کمال کے تعلق سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیا چیز ناپسند کرتا ہے؟ دونوں چیزیں: عمل کو بھی اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے اور عمل کرنے والے کو بھی اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے۔

جب نافرمانی کی بات ہو رہی ہے اور اُس عمل کی بات ہو رہی ہے جو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے تو پھر قرآن اور سنت میں یہ ہمیں دلیل ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو ناپسند کرتا ہے، بُرے عمل کو بھی اور اُس عمل کرنے والے کو بھی۔

اب عمل کو ناپسند کرتا ہے اس کی کیا دلیل ہے؟ یہی آیت ہے سورۃ التوبہ آیت نمبر 46 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ﴾ (اُن کا جہاد میں نکلنا اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا ہے)۔

ناپسند کیوں کیا اللہ تعالیٰ نے وجہ کیا ہے؟ کیونکہ منافق ہیں مخلص ہیں ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کون سا عمل پسند فرماتا ہے؟ اور کون سا عمل قبول ہوتا ہے جس کی اساس کیا ہے؟ سب سے پہلی شرط کیا ہے عمل صالح کی؟ اخلاص ہے۔ منافق کے پاس کون سا اخلاص ہے؟! اخلاص تو ہے ہی نہیں نا!

اور دوسری دلیل کہ اللہ تعالیٰ عمل کو ناپسند کرتا ہے سورۃ الاسراء آیت نمبر 38 میں: ﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا﴾ ، جب مختلف اللہ تعالیٰ نے نافرمانیوں کا ذکر کیا ہے ان آیات کریمہ میں تو اللہ تعالیٰ نے اختتام ان آیات کا اس لفظ سے کیا ہے ﴿مَكْرُوْهًا﴾، یہ سب ناپسندیدہ یہ تمام اعمال ہیں۔

اب عامل کو ناپسند اللہ تعالیٰ کرتا ہے اس کی دلیل کیا ہے؟ جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں آیا ہے اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''إِنَّ اللهَ تَعَالَىٰ إِذَا أَبْغَضَ عَبْدًا، نَادَى

جِبْرِيلَ، إِنِّي أُبْغِضُ فُلَانًا فَأَبْغِضْهُ"إلي آخر الحديث:(لمبی حدیث ہے یہ اور اس میں دلیل ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد حدیث قدسی میں: کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو ناپسند کرتے ہیں تو سیدنا جبریل علیہ الصلاۃ والسلام سے فرماتے ہیں کہ اے جبریل! میں فلاں شخص کو ناپسند کرتا ہوں تم بھی اُسے ناپسند کرو)۔اور اس طریقے سے وہ شخص جو ہے اسے فرشتے بھی ناپسند کرتے ہیں اور (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ بھی اُس شخص کو ناپسند کرتا ہے۔

تو ان آیات کریمہ سے اور ان صحیح احادیث سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کمال میں سے ایک صفت **الكُرْه** جو ہے کہ اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے یہ بھی ثابت ہے۔

5-اس تعلق سے پانچویں آیت جو ہے جسے شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے بطور دلیل پیش کیا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (الصف:3)۔

﴿كَبُرَ﴾:"بمعنى: عظم":یہ بہت بڑی بات ہے۔

﴿مَقْتًا﴾ :اس کا جو اعراب ہے یہ "تمييز محول عن الفاعل، والمقت أشد البغض"۔مقت کسے کہتے ہیں؟ بہت شدید ناپسندیدگی۔

عربی زبان میں مقت کہتے ہیں شدید ناپسندیدگی کو، جب آپ کسی چیز کو ناپسند کرتے ہیں تو آپ اس سے نفرت کرتے ہیں اور اس کا لفظ جو ہے وہ كُرِهَ ہے، اور جب شدید ناپسند کرتے ہیں بہت زیادہ ناپسند کرتے ہیں تو اس کے لیے لفظ ہے مقتا ہے، مقت جسے کہتے ہیں۔

اور ﴿كَبُرَ﴾ کا فاعل جو ہے فاعل کی تمیز تحویل کے بعد "(أن) وما دخلت عليه في قوله: ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾"۔

اور یہ آیت جو ہے یہ تعلیل ہے اس سے پہلے والی آیت کے تعلق سے اس سے پہلے کون سی آیت ہے؟ سورۃ الصف آیت نمبر 2 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝٢ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾(الصف:2-3)۔

تو شیخ صاحب فرماتے ہیں (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ): یہ بہت بڑی بات ہے کہ کوئی شخص ایسی بات کرے جس پر وہ عمل نہ کرنے والا ہو اور وجہ یہ ہے کہ اگر آپ کوئی ایسی بات کرتے ہیں اور اس پر عمل نہیں کرتے تو آپ کی حالت دونوں میں سے ایک ضرور ہے: (۱) یا تو آپ جھوٹ بولتے ہیں جو آپ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں ہیں، لوگوں کو ڈراتے ہیں لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے جبکہ اُس بات کی حقیقت (یعنی اس کی کوئی حقیقت) نہیں باقی رہتی۔ (۲) اور یا آپ تکبر کرنے والے ہیں لوگوں کو حکم دیتے ہیں کسی چیز کو کرنے کا اور خود اُس پر عمل نہیں کرتے، اور لوگوں کو کسی چیز سے روکتے ہیں اور خود وہ عمل کرتے رہتے ہیں (اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت ہی شدید ناپسند ہے)۔

تو مقت کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے اور مقت جو ہے شدید ناپسندیدگی کا معنی موجود ہے اس لفظ میں (مقت کے لفظ میں)۔

اور اس آیت میں جو اللہ تعالیٰ کی صفت ثابت ہوئی ہے مقت کی صفت ہے (شدید ناپسندیدگی) اور یہ مقت جو ہے متفاوت ہے۔

اور مسلکی فائدہ جو ہمیں ہوتا ہے عملی طور پر: کہ انسان خبردار رہ جاتا ہے کہ جو بات وہ کرتا ہے اُس پر اسے عمل کرنا چاہیے کہیں یہ نہ ہو کہ انسان کوئی بات کرے اور اس پر عمل نہ کرے، جب ایسا معاملہ ہوتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی شدید ناپسندیدگی کا باعث بنتا ہے۔

پھر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے دو مزید صفات کمال کا ذکر کیا ہے: ''صفة المجيء والإتيان'' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا آنا جو ہے۔

دو لفظ ہیں ملتے جلتے اور بنیادی معنی ایک ہی لیکن جب دو مختلف الفاظ ہیں "المجیء والإتیان" تو اس کا مطلب ہے (یہ قاعدہ سمجھ لیں ذرا ایک علمی بات ہے) اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے باب میں جب ایک ہی ملتے جلتے معنی کے الفاظ موجود ہوں اور الفاظ مختلف ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں صفات کا ایک معنی نہیں ہے جبکہ اساسی بات ایک ہی ہے۔

جیسے دیکھیں صفۃ الرحمۃ ہے لیکن اس میں الرّحمٰن اور الرّحیم بھی ہے، ذُو الرّحمۃ بھی ہے۔ یہ الفاظ ثابت ہیں نا اب ان میں کیا فرق ہے کوئی فرق ہے ؟ اصل صفۃ الرحمۃ تو ثابت ہے اللہ تعالیٰ کے لیے کہ اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے، تو رحمٰن میں جو معنی ہے رحیم میں نہیں ہے جو رحیم میں ہے رحمٰن میں نہیں ہے، "ذُو الرّحمۃ" (رحمت والا) اُن دونوں میں نہیں ہے۔

تو قاعدہ کیا ہے اس معاملے میں ؟ کہ جب ایک ہی صفت کے تعلق سے دو مختلف الفاظ ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ معنی تو ایک ہی ہے لیکن معنی کی مزید مضبوطی سے

سوال: یہ شرط ہے کہ الگ الگ جگہ پے ہو یا ایک ساتھ ہو ؟

جواب: نہ نہ وہ تو اگر صفۃ الرحمٰن کئی آیات میں آیا ہے اس کا ایک ہی معنی ہے، رحیم کا ایک ہی معنی ہے، اصل میں اساس، صفت کون سی ہے ؟ "الرحمۃ" وہ ثابت ہوتی ہے دونوں سے۔ رحمٰن اور رحیم میں صفۃ الرحمۃ ثابت ہو گئی ہے لیکن جو معنی کی مضبوطی رحمٰن میں ہے وہ رحیم میں نہیں ہے اور جو رحیم میں ہے اصل مقصد وہ رحمٰن میں نہیں ہے۔

"الرحمن الرحمة الواسعة" (وسیع رحمت والا): جس میں کافر بھی شامل ہے، اس میں درند اور پرند بھی شامل ہے، سب اُس رحمت میں شامل ہیں۔

رحیم کی رحمت میں خاص مومنوں کے لیے رحمت ہے۔ اگر مومنوں پر خاص رحمت نہ ہوتی تو رحمٰن کی رحمت میں مومن بھی شامل ہیں کہ نہیں ؟ وہ بھی شامل ہیں۔ تو یہ خصوصی رحمت اس لیے ہے کیونکہ مومن کی شان بلند ہے مومن کی اپنے ایمان سے ایک خصوصی جگہ اس کی ہے اب اس مخصوص جگہ کی وجہ سے رحمت بھی اس کے لیے خاص ہے۔ اس لیے علماء کیا کہتے ہیں ؟ "الرحمن : ذو الرحمة الواسعة ، والرحيم : ذو الرحمة الواصلة": پہنچنے والی ہے اہل ایمان کے لیے۔

اب قاعدہ یہ ہے کہ جب ملتے جلتے معنی کے مختلف الفاظ ہوں تو اس کا مطلب کیا ہے ؟ دونوں ثابت ہیں اور ایک دوسرے سے معنی زیادہ مضبوط ہے۔

’’المجيء والإتيان‘‘ ترجمہ کیا ہے دونوں کا؟ آنا۔ اردو میں یہی ترجمہ ہے نا لیکن کیا معنی دونوں کا ایک ہے ؟ یعنی المجيء اگر صفت ہوتی تو إتیان کی ضرورت نہیں ہوتی تھی ؟ دوسرے لفظ کی ضرورت ہے کہ نہیں ہے ؟ جب موجود ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ الإتیان جو ہے اُس میں آنے کے معنی کی زیادہ مضبوطی پائی جاتی ہے، یعنی اگر کوئی انکار بھی کرے نا مجئ کا (آنے کا) کہ اللہ تعالی کیسے آتا ہے (جیسا کہ آگے بیان ہوگا)، اور اہل تعطیل اہل بدعت نے انکار کیا ہے کہ اگر آنے کے لیے جسم کا لازمی ہونا ہے اور جسم اگر آتا ہے (کیونکہ جسم ہی آسکتا ہے نا) اور جسم اللہ تعالی کے لیے جائز نہیں ہے، تو یہ مختلف اُن کے عقل پرست جو ہیں جو عقل کو آگے کرکے خود اُس سے ٹھوکر کھاتے ہیں جیسے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں۔

تو "المجئ" میں معنی ہے آنے کا "إتیان" میں بھی معنی ہے آنے کا، لیکن إتیان میں جو معنی ہے وہ مجئ سے زیادہ مضبوط معنی ہے۔ اگر کوئی مجئ کا انکار کرے تو إتیان کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہے؟ اور اس کی دلیل کیا ہے کہ إتیان کا معنی جو ہے وہ زیادہ مضبوط ہے مجئ سے؟ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ﴾ (جب اللہ تعالی نے اُن کو ہلاک کرنا چاہا (قوم کو) تو ان کی جو بنیادیں ہیں وہیں سے اُن کا خاتمہ کر دیا ہے) (النحل:26)۔

تو ﴿اَتَى﴾ میں جاء کا لفظ نہیں ہے، تو ﴿اَتَى﴾ میں جو معنی ہے آنے کا زیادہ مضبوط ہے کہ نہیں؟ زیادہ مضبوط ہے۔

یہ صفات بھی صفات الکمال میں سے ہیں کیونکہ اللہ تعالی کی ہر صفت کمال ہے، آیئے دیکھتے ہیں اس کی دلیل کیا ہے (اس صفت کی یا ان صفات کی دلیل کیا ہے) اور ان میں چار آیتیں شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے بیان کی ہیں اس صفت کو ثابت کرنے کے لیے:

1- پہلی آیت میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ﴾ إلي آخر الآية (البقرۃ:210)۔

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قوله''(اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے)﴿هَلْ يَنْظُرُونَ﴾: ''﴿هَلْ﴾: استفهام بمعنى النفي، يعني: ما ينظرون''، اور قاعدہ یہ ہے(شیخ صاحب فرماتے ہیں)جب استفہام کے بعد اِلَّا ہو تو اس کا معنی جو ہے نفی کا ہوتا ہے۔

یعنی﴿هَلْ﴾ کیا ہے استفہام کے لیے ہے کہ نہیں؟﴿هَلْ﴾ سوالیہ جملہ ہے نا سوالیہ حرف ہے﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّآ﴾: تو اِلَّا استفہام کے بعد آیا ہے نا تو اس کا معنی نفی ہے۔یعنی جملے میں اگرچہ لفظ کوئی ہے نفی کا؟"لَا" یا"مَا" یا کچھ جس سے نفی ہوتی ہے؟نہیں ہے نا۔

تو عربی قاعدہ ہے یہ کہ جب استفہام کے بعد اسی سیاق وسباق اور اسی جملے میں اِلَّا کا لفظ موجود ہو تو معنی کیا ہے؟ نفی کا معنی دیتا ہے۔

﴿هَلْ يَنْظُرُونَ﴾: ''يعني: ما ينظرون: ﴿يَنْظُرُونَ﴾: يعني: ينتظرون'': یعنی کیا وہ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ آئے(یعنی قیامت کے دن حساب کے لیے)۔

یہ دیکھیں''﴿يَنْظُرُونَ﴾ : وينتظرون''۔لفظ کیا ہے؟﴿يَنْظُرُونَ﴾۔"ینظرون" کس چیز کو کہتے ہیں؟دو معنی ہیں:(ا)ایک دیکھنے کو کہتے ہیں۔(۲)اور ایک انتظار کو بھی کہتے ہیں''ينتظرون''۔

فرق کیا ہے؟اگر حرف جَر کے ساتھ ہو متعدی''﴿يَنْظُرُونَ﴾ : (إلى)''۔معنی کیا ہے؟دیکھنا۔اگر يَنظُرُ کے بعد اِلیٰ کا حرف ہو"يَنظُرُ إلى"تو دیکھنے کے لیے ہے۔

اگر حرف جَر نہ ہو یَنظُرُ کا معنی ہے"يَنتَظِرُ"(انتظار کرنا)۔

قاعدہ واضح ہے؟دیکھیں کتنی پیاری زبان ہے اور کتنا پیارا سیاق اور سباق ہے!نفی کے لیے کوئی نفی کا حرف نہیں ہے، استفہام ہے اور پھر اِلَّا ہے تو معنی نفی کا آ گیا ہے۔

انتظار کا لفظ نہیں ہے يَنظُرُ کا ہے اس کے ساتھ حرف جَر نہیں ہے تو اس لیے اس کا معنی ہے انتظار۔

اور اور پیارا معنی دیکھیں: ﴿اَنۡ يَّاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ﴾: "ظُلَلٍ" جمع ظِل ہے (سایہ) "غمام" سفید بادل کو کہتے ہیں۔

﴿فِىۡ ظُلَلٍ﴾ اس کا معنی کیا ہے؟ کہ جب اللہ تعالیٰ آئے گا یا فرشتے آئیں گے کیا نعوذ باللہ اس سے ﴿فِىۡ﴾ حرف جَر کے لیے ہے اور فِی ظرفیہ کے استعمال ہوتی ہے) بادلوں نے گھیرا ہو گا اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ)؟ نا ممکن ہے۔

جب معنی ممکن نہیں ہے تو ﴿فِىۡ﴾ کا معنی کیا ہے؟ اور قاعدہ کیا ہے؟ کہ حرف جَر ایک دوسرے کی جگہ لے لیتے ہیں، "﴿فِىۡ﴾: يعنى (مع)" (ساتھ) "فهي للمصاحبة، وليس للظرفية قطعاً" (ظرفیہ کے لیے نہیں ہے)، کیونکہ اگر ہم یہ کہیں گے فِی کا یہی معنی ہے جو اس لفظ میں موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بادلوں نے اللہ تعالیٰ کا احاطہ کیا ہوا ہے (نعوذ باللہ)، اور اللہ تعالیٰ واسع علیم ہے اور کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتی اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے (یہ قاعدہ ہے)۔

﴿فِىۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ﴾: یعنی "مع الظلل، فإن الله عند نزوله جل وعلا للفصل بين عباده ﴿تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالۡغَمَامِ﴾ (الفرقان:25)" (جب اللہ تعالیٰ فیصلے کے لیے آئے گا قیامت کے دن تو آسمان پھٹے گا اور بادل بھی ہوں گے)۔

غمام کہتے ہیں سفید بادل کو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَظَلَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡغَمَامَ﴾ (البقرۃ:57)، بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے ایک خاص بادل جو تھا جہاں پر چلتے تھے صحرا میں جب بھٹک گئے تھے چالیس سال تو سائے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی اُن کے لیے تو ایک خاص سفید بادل تھا جہاں پر جاتے تھے وہ بادل اُن کے سَر پر ہوتا تھا۔

اور سفید بادل جو ہے اُس کی ایک خاص خصوصیت بھی ہے کہ اُس سے دن کی روشنی باقی رہتی ہے، لیکن جو کالا بادل ہوتا ہے یا دوسرا ڈارک کلر (Dark Color) کا جو بادل ہوتا ہے اُس سے روشنی کم ہو جاتی ہے۔

﴿وَالۡمَلٰٓـئِكَةُ﴾: فرشتوں سے مراد جو اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں وہ بھی قیامت کے دن آئیں گے اور فرشتوں کے آنے کا جو طریقہ ہے (سبحان اللہ) قیامت کے دن جو پہلا آسمان ہے "السماء الدنيا" وہ فرشتے نازل ہوں گے، پھر دوسرے

آسمان کے، پھر تیسرے آسمان کے، پھر چوتھے کے، پانچویں کے، چھٹے کے، پھر ساتویں آسمان کے تمام فرشتے نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ بھی آئے گا قیامت کے دن حساب کے لیے اور گھیر لیں گے تمام مخلوقات کو حساب کے لیے۔

اور اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ خبر دار کیا جارہا ہے کہ وہ دن جو ہے قیامت کا دن جو ہے بہت ہی عظیم دن ہے اور اُس دن جب اللہ تعالیٰ حساب کے لیے آئے گا (جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے) فرشتے بھی ہوں گے۔

فرشتوں کی بہت زیادہ تعداد ہو گی آپ یہ دیکھیں، اور ہر آسمان کا فرشتہ اس ترتیب سے نازل ہو گا یعنی زمین باقی یہ زمین نہیں رہے گی تانبے جیسی ہو گی، آسمان بھی یہ نہیں رہے گا جو آسمان ہے، پھٹ جائے گا۔ پھر حساب کے لیے جو میدان ہو گا وہاں پر ہر طرف سے فرشتوں نے گھیر رکھا ہو گا۔

تو اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے اور یہ ان آیات کریمہ میں پیغام ہے جو جھٹلانے والے ہیں کہ وہ خبر دار ہو جائیں وہ جھٹلا کیوں رہے ہیں؟!

تو یہ پہلی آیت ہے جس میں یہ ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حساب کے لیے آئیں گے۔

2-دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ﴾ إلي آخر الآية (الانعام:158)۔

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ﴾، واضح ہے جیسے پہلے گزر چکا ہے کہ استفہام ہے اور پھر ﴿اِلَّآ﴾ ہے اس سے مراد نفی ہے، یعنی "وہ نہیں اس انتظار میں مگر"۔

﴿تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ :(فرشتے آئیں) ﴿اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ﴾، فرشتے جو ہیں ﴿اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ اُن کی روح قبض کرنے کے لیے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ إلي آخر الآية (الانفال:50)۔

دوسری بات جو ہے: ﴿اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ﴾: "يوم القيامة للقضاء بينهم" (کہ اللہ تعالیٰ بھی آئیں گے قیامت کے دن)۔

تیسری چیز جو ہے: ﴿أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ﴾: (یا اللہ تعالیٰ کی بعض آیات جو ہیں تیرے ربّ کی بعض آیات بھی آئیں گی)۔ اور اس سے مراد کیا ہے کون سی آیت ہو گی؟ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے صحیح حدیث میں کہ سورج کا مغرب سے نکلنا جو ہے، متفق علیہ حدیث میں آیا ہے کہ اس آیت سے مراد جو ہے وہ سورج کا مغرب سے نکلنا ہے۔

ترتیب بڑی پیاری ہے! اگر آپ غور کریں فرشتوں کا آنا، پھر اللہ تعالیٰ کا آنا، اور پھر اللہ تعالیٰ کی بعض آیات جیسا کہ مغرب سے سورج کا نکلنا: (۱) جب فرشتے آئیں گے روح قبض کریں گے (روح قبض کرنے والے فرشتے جو ہیں) توبہ کا دروازہ بند۔ (۲) جب سورج مغرب سے نکلے گا توبہ کا دروازہ بند۔ (۳) اور دونوں کے بیچ میں اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ آئے گا ﴿يَأْتِيَ رَبُّكَ﴾ سبحان اللہ۔ کیا پیغام ہے؟ کہ ابھی وقت ہے توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے اس سے پہلے کہ دروازہ بند ہو جائے اور حساب کے لیے اللہ تعالیٰ آئے قیامت کے دن قیامت قائم ہو جائے، توبہ کر لو اور اپنی اصلاح کر لو۔

بہت پیارا پیغام ہے سبحان اللہ!

شیخ صاحب فرماتے ہیں (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ): اس آیت سے اور اس سے پہلے والی آیت سے غرض یہ ہے بیان کرنا کہ ان جھٹلانے والوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ ابھی وقت ہے اپنی اصلاح کر لیں اور اپنے اعمال کو درست کر لیں تاکہ اس وعید سے بچ سکیں۔

3- تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾﴾ (الفجر: 22-21)۔

﴿كَلَّا﴾: تنبیہ کے لیے ہے جب کسی کو متنبہ کیا جاتا ہے تو "كَلَّا ، أَلَا" سے جملے کی ابتداء ہوتی ہے۔

﴿إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ﴾: یہ قیامت کے دن کا ذکر ہے کہ جب زمین کا خاتمہ ہو گا تو زمین پر آہستہ آہستہ زلزلے ہوں گے، پھر زمین ہلے گی اور پھر جیسا کہ ایک بلڈنگ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتی ہے اور ختم کر دیا جاتا ہے تو زمین کا بھی خاتمہ ہو گا۔

اور یہاں پر تاکید ہے کہ اس میں جو بڑے بڑے پہاڑ ہیں، زمین پر جو بھی چیزیں موجود ہیں وہ ساری کی ساری ختم ہو جائیں گی اور بالکل جیسا کہ ایک جلد ہوتی ہے نا "أديم" بالکل زمین ہموار ہو جائے گی برابر ہو جائے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے سورۃ طہ میں: ﴿فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ لَا تَرَى فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ﴿١٠٧﴾﴾ (کہ زمین بالکل ہموار ہو جائے گی، نہ تو اس میں کوئی گہرائی ہو گی اور نہ اس میں کوئی اونچائی ہو گی (سب برابر کر دیا جائے گا قیامت کے دن))(طہ:106-107)۔

شاہد کیا ہے یہاں پر دلیل؟ ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (الفجر:22)(یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آئے گا(یعنی حساب کے لیے)اور فرشتے بھی آئیں گے)۔

یہاں پر لفظ﴿وَالْمَلَكُ﴾ (الفجر:22)، پچھلی آیت میں ﴿وَالْمَلَآئِكَةُ﴾(البقرۃ:210)فرق ہے دونوں میں؟ملائکۃ جمع ہے نا اور مَلَك جمع ہے کیا؟ مَلَك جمع ہے یا سنگل ہے مفرد ہے کہ نہیں؟ مفرد ہے۔ کیا اس میں کوئی تضاد ہے کنٹراڈکشن (Contradiction) ہے؟

اب اللہ تعالیٰ تو آئے گا حساب کے لیے بعض آیات میں ملائکۃ کا ذکر ہے (جمع) جمع کی صورت میں اور اس آیت میں مفرد مَلَك کا ذکر ہے ﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ مَلَك ایک ہے یا ایک سے زیادہ ہے؟ ایک ہے۔ تو ایک فرشتہ آئے گا بس تو "ال" کیا ہے؟ "ال" جنس کے لیے ہے یعنی فرشتوں کی جنس۔ عموم کے لیے ہے کہ نہیں؟ یعنی سارے فرشتے ہوں گے نہیں؟

دیکھیں یہ انداز بیان کی خوبصورتی دیکھیں آپ! چاہے جمع کا صیغہ ہو یا مفرد کا صیغہ ہو لیکن "ال" ہے تو ﴿الْمَلَكُ﴾ سے مراد تمام فرشتے ہیں۔

﴿صَفًّا صَفًّا﴾ (صفیں باندھ کر)۔ جیسے پہلے گزر چکا ہے صفیں کیسی ہوں گی؟ پہلے السماء الدنیا کے فرشتے وہ صف باندھیں گے، پھر دوسرے آسمان کے فرشتے وہ صف ہو گی، پھر تیسرے کے، ہر آسمان کے فرشتے اپنی اپنی صف میں ہوں گے۔

4- چوتھی آیت جو ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سورہ الفرقان میں: ﴿وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيلًا﴾ (الفرقان:25) "يعني: اذكر يوم تشقق السماء بالغمام": قیامت کے دن آسمان کے خاتمے سے پہلے (یا آسمان کا خاتمہ ہو جائے گا تمام مخلوقات کا خاتمہ ہو جائے گا) جب آسمان کا خاتمہ ہو گا اُس سے پہلے آسمان پھٹنا شروع ہو گا اُس میں دراڑیں پڑ جائیں گی اور آسمان پھٹنا شروع ہو جائے گا۔

اور ﴿تَشَقَّقُ﴾ کا لفظ جو ہے یعنی آہستہ آہستہ دراڑیں پڑیں گی آسمان میں اور سوراخ ہو جائیں گے پھر آہستہ آہستہ وہ بڑھیں گے اور اُس میں سے دھواں نکلنا شروع ہو جائے گا اور آہستہ آہستہ آسمان کا خاتمہ ہو جائے گا اور بادل بھی آہستہ آہستہ جو سفید بادل ہوں گے غمام جو ہے وہ بڑھتا جائے گا اور یہ علامت ہو گی اللہ تعالیٰ کے آنے کی جیسا کہ پچھلی آیت میں گزر چکا ہے۔

اور فرشتے نازل ہوں گے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے آنے کا ذکر ہے؟ نہیں ہے۔ لیکن اس آیت کے سیاق وسباق اور پچھلی آیات کا سیاق وسباق ایک ہے۔ تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب آسمان پھٹے گا اور فرشتے نازل ہوں گے کس لیے نازل ہوں گے؟ آسمان کیوں پھٹے گا؟ خاتمہ ہو جائے گا نا دنیا کا۔ فرشتے کیوں نازل ہوں گے کس لیے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آنا ہے اور حساب شروع ہونا ہے۔

تو یہ چار آیات ہیں جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بیان کی ہیں اللہ تعالیٰ کے آنے کی صفت میں اور ان چاروں صفات میں "صفة المجيء والإتيان" ثابت ہو جاتی ہے۔

اور ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفات جو ہیں صفات الکمال ہیں اور اس پر اہل سنت والجماعت جو ہیں من وعن سے تسلیم کرتے ہیں اور مانتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے۔

لیکن اہل بدعت کا اور معاملہ رہا ہے اور اہل بدعت نے ان صفات کا انکار کیا ہے، آیئے دیکھتے ہیں اہل بدعت نے اللہ تعالیٰ کے "صفة المجيء "اللہ تعالیٰ کے آنے کی صفت کا کس طریقے سے انکار کیا ہے۔

اہل التحریف اور اہل التعطیل نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ آئیں گے نہیں قیامت کے دن کیونکہ اگر آپ یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آئے گا تو اس کے لیے جسم کو ہونا لازمی ہے اور جسم جو ہیں متماثل ہوتے ہیں ایک جیسے ہوتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے جائز نہیں ہے)۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں: یہ دعویٰ جو ہے اور قیاس جو کیا گیا ہے یہ باطل ہے کیونکہ پہلی بات ہے کہ نص کے مقابلے میں ہے، جب نص آ گیا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان واضح ہے اور ایک سے زیادہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے تو کوئی بھی بات جو نص کے مخالف ہو دلیل کے مخالف ہو وہ قابل قبول نہیں ہے، اور جو چیز نص کو باطل کرنے کے لیے بیان کی جاتی ہے وہ خود باطل ہو جاتی ہے۔

بڑا پیارا قاعدہ ہے سمجھیں ذرا اس قاعدے کو: ایک دلیل موجود ہے واضح دلیل ہے نص موجود ہے اب جو چیز اس نص کے مقابلے میں ہوتی ہے اس کے مخالف جو باطل کرنے کے لیے ہوتی ہے اب دونوں میں سے چیز ہے: (۱) یا تو وہی بات باطل ہے جو نص کو باطل کرنے کے لیے ہے۔ (۲) یا نص باطل کرنا پڑے گا آپ کو۔

دونوں میں سے ایک ہوگا نا، کہ نص موجود ہے واضح دلیل موجود ہے کسی نے اس دلیل کی مخالفت کی ہے اب دونوں میں سے ایک بات لازم ہے: یا تو دلیل غلط ہے نص غلط ہے وہ باطل ہے، جس نے اس کے مخالف جو بات کی ہے وہ باطل ہے۔ دونوں تو ایک ساتھ نہیں ہو سکتیں نا!

اس کی دلیل کیا ہے سورۃ سبأ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَإِنَّآ أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ﴾

(ہم اور آپ یا تو ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں (ہم دونوں میں سے ایک لازمی ہے)) (سبأ:24)۔

یعنی جو انبیاء کے مخالفین تھے (علیہم الصلاۃ والسلام) انبیاء اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آئے مخالفین نے مخالفت کی ہے اور اپنی جو بھی اُن کی غلط فہمیاں، شبہات تھے سب سامنے رکھ دیئے، اب مزید زیادہ سمجھانے کے باوجود سمجھنا نہیں چاہتے ردّ کر دیا نا (نعوذ باللہ) انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی دعوت کو اور اکثریت نے ردّ کیا (اکثریت نے!)۔

کتنا پیارا جواب ہے ﴿وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ !دونوں میں سے ایک بات ضرور ہے اگر ہماری بات غلط ہے اور تمہاری بات صحیح ہے مطلب کیا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام غلط ہے ؟!ہم دونوں میں سے ایک کھلی گمراہی میں لازمی ہے کون ہو سکتا ہے وہ جو مخالفت کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی یا اللہ تعالیٰ کا پیغام غلط ہو سکتا ہے ؟سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا پیغام وحی ہے اور وحی حق ہے جو کبھی غلط نہیں ہو سکتی ہے، دنیا کے سارے دانشور بھی مل کر ایک ساتھ ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں اسے باطل کرنے کی کوشش کریں وہ باطل کبھی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ خالق کا حکم ہے، مخلوق خود مسکین ہے حقیر ہے فقیر ہے کمزور ہے اس کی رسائی کبھی وہاں تک ہو ہی نہیں سکتی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

تو قاعدہ کیا ہے ؟جس نے بھی نص کے خلاف نص کی مخالفت کی ہے تو اب اُس کے سامنے ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ یا تو نص غلط ہے اسے باطل کرو، یا اُس کی اپنی بات باطل ہے۔حق دونوں میں سے ایک چیز میں ہے نا!

اب ان لوگوں نے جنھوں نے انکار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حساب کے لیے نہیں آئیں گے کیونکہ اس سے اُن کی سوچ کے مطابق کہ اللہ تعالیٰ کے آنے کے لیے جسم کا ہونا لازمی ہے اور جسم میں متماثل ہے مخلوق کے جیسا ہو جائے گا تو اس لیے اللہ تعالیٰ کے لیے جائز نہیں ہے، اِن چار آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ آئے گا نص موجود ہے کہ نہیں ؟

قاعدہ کیا کہتا ہے ؟کہ جب نص موجود اور واضح ہو اور اس کی مخالفت کی جائے تو دونوں میں سے ایک باطل ہے۔تو باطل نص ہے ؟یا باطل تمہاری یہ غلط سوچ ہے ؟یا غلط تمہارا کہنا ہے ؟یا تمہارا جو غلط اعتراض ہے ؟تو پہلی بات یہ ہے۔

پھر شیخ صاحب فرماتے ہیں :آخر وجہ کیا ہے یعنی کیا مانع ہے کہ اللہ تعالیٰ خود قیامت کے دن حساب کے لیے نہیں آسکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے ؟کہتے ہیں "کہ اگر ہم مانتے ہیں تو پھر تمثیل لازمی آتی ہے مماثلت لازمی آتی ہے"۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں ہم یہ کہتے ہیں کہ غلط بات ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ آنے کا معنی جو ہے (آنا جو ہے) وہ مخلوقات میں بھی متفاوت ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ جب کوئی تندرست اور چست انسان آتا ہے وہ ایسے نہیں آتا جیسا کہ

ایک کمزور اور بیمار شخص آتا ہے (دونوں ایک جیسے آتے ہیں ؟ !) دونوں کا آنا مختلف ہے، اور اس اعتبار سے کئی مخلوقات کو دیکھیں کہ اُن کا آنا جو ہے بالکل مختلف ہوتا ہے۔

آنے کا معنی سب کو پتہ ہے کہ آنے کا معنی کیا ہے لیکن اس کی جو کیفیت ہے وہ مختلف ہے جب مخلوق میں یہ اختلاف اور تفاوت پایا جاتا ہے آپس میں تو خالق مخلوق میں کیوں نہیں ہو سکتا ؟ !

پھر شیخ صاحب فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے ﴿وَّ جَآءَ رَبُّكَ﴾ (اور تیرا ربّ آیا)، اور اس جیسی آیات جو ہیں اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں ؟

کہتے ہیں اصل معنی یہ ہے آنے کا: ﴿وَّ جَآءَ رَبُّكَ﴾ یعنی "جاء أمر ربك" (تمہارے ربّ کا حکم آیا ہے)، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰهِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡهُ﴾ (اللہ تعالیٰ کا حکم آیا ہے اس میں جلدی مت کرو (النحل: 1)۔ اور اہل التعطیل نے (انکار کرنے والوں نے) یہ کہا ہے: "واجب یہ ہے کہ جتنی بھی اللہ تعالیٰ کے آنے کی صفت کا ذکر ہوا ہے قرآن مجید میں اُسے اس آیت کے تناظر میں تفسیر کیا جائے (اس آیت کو مد نظر رکھ کر تفسیر کی جائے)، یعنی ﴿اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰهِ﴾ جہاں پر اللہ تعالیٰ کے آنے کا ذکر ہے تو آپ کہیں "أتى أمر الله" اللہ تعالیٰ کا حکم آیا ہے"۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں: جو دلیل آپ نے پکڑی ہے یہ تمہارے خلاف دلیل ہے نا کہ تمہارے حق میں۔

وہ کیسے ؟ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آنا مراد ہے تو اللہ تعالیٰ نے بیان کیوں نہیں فرمایا دوسری آیات میں جہاں پر حکم کا ذکر نہیں ہے ﴿وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الۡمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ مثال کے طور پر، اللہ تعالیٰ کا فرمان، "وجاء أمر ربك" اللہ تعالیٰ فرما دیتا نا!

جہاں پر حکم کا آنا تھا وہاں پر اللہ تعالیٰ حکم کو بیان فرمایا ہے جہاں پر حکم کا لفظ نہیں ہے وہاں پر مطلب کیا ہے ؟ کہ حکم کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا خود کا آنا معنی مراد ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ کیا جن آیات میں اللہ تعالیٰ کے آنے کا ذکر ہے یہ واضح آیات ہیں مجمل نہیں ہیں۔ یعنی قاعدہ کیا ہے ؟ اگر مجمل آیت ہے تو اسے وضاحت کے لیے دوسری آیت کو دیکھنا پڑتا ہے جو مجمل نہیں ہوتی ہے، تو جن آیات

میں اللہ تعالیٰ کے آنے کا ذکر ہے یہ آیات جو ہیں ساری کی ساری جو ہیں واضح آیات ہیں جن میں وضاحت کے لیے کسی دوسری آیت کی ضرورت نہیں پڑتی، یعنی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿هَلۡ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأۡتِيَهُمُ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ أَوۡ يَأۡتِيَ رَبُّكَ أَوۡ يَأۡتِيَ بَعۡضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ﴾ (الانعام:158)۔یعنی کوئی شخص اگر یہ کہے کہ اس آیت میں ﴿يَأۡتِيَ رَبُّكَ﴾ سے مراد ''يأتي أمر ربّك'' کیا معنی مستقیم ہوگا کبھی؟! مستقیم معنی نہیں ہوگا۔

پھر شیخ صاحب فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس آیت میں آپ لوگ کیا کہتے ہیں: ﴿فَعَسَى ٱللَّهُ أَن يَأۡتِيَ بِٱلۡفَتۡحِ أَوۡ أَمۡرٖ مِّنۡ عِندِهِۦ﴾ إلي آخر الآية (المائدۃ:52)؟

﴿أَن يَأۡتِيَ بِٱلۡفَتۡحِ أَوۡ أَمۡرٖ مِّنۡ عِندِهِۦ﴾: بات فتح کی ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف آنے کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ فتح بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، اور عربی زبان میں یہ معروف ہے کہ اگر آنے کے ساتھ حرف جَر کی قید ہو تو اس کا معنی اور ہوتا ہے اور اُس کے بغیر ہوگا حرف جَر کے تو اس کا معنی اور ہوتا ہے۔

یعنی﴿فَعَسَى ٱللَّهُ أَن يَأۡتِيَ بِٱلۡفَتۡحِ أَوۡ أَمۡرٖ مِّنۡ عِندِهِۦ﴾:﴿بِٱلۡفَتۡحِ﴾ حرف جَر ہے اس کا کیا معنی ہے؟ کہ یہ فتح اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوئی ہے (اللہ تعالیٰ سے فتح ہوئی ہے)، تو آنے سے مراد فتح کا آنا ہے۔اور اگر حرف جَر نہ ہو اور اِتیان کا لفظ ہو (آنے کا لفظ ہو) اس کا معنی ہے کہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کا آنا معنی مراد ہے۔

تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت "المجيء والإتيان" اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے اور جن لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے اور یہ کہا ہے "کہ اس میں مماثلت لازم آتی ہے جسم کا ہونا لازم ہے"، تو اُن کی یہ غلط بات ہے کیونکہ ایک تو نص ہے اور نص کے وجود میں دلیل کے وجود میں کوئی بھی بات اس کی مخالفت میں قابل قبول نہیں ہوتی کیونکہ اس سے یہ بات لازمی آتی ہے کہ نص کو باطل قرار کرنا پڑے گا کہ نص کو چھوڑنا پڑے گا۔

اور حق یہ ہے کہ نص مقدم ہے اور عقل جو ہے وہ مؤخر ہے، نص سب سے پہلے ہے۔ عقل کبھی بھی نص یا دلیل کے آگے نہیں بڑھ سکتی بلکہ عقل جو ہے (جو صحیح عقل ہے) وہ شریعت کی حدود میں رہ کر بات کرتی ہے (نصوص کی حدود میں رہ کر)۔

اور دوسری بات یہ ہے جہاں پر اللہ تعالیٰ کے حکم کا ذکر ہے وہاں پر حکم ہی مراد ہے، جہاں پر حکم کا ذکر نہیں ہے اُمر کا ذکر نہیں ہے وہاں پر اللہ تعالیٰ کے خود آنا مراد ہے۔

اور جو مسلکی فائدہ ہے عملی فائدہ جو ہمیں ملتا ہے اللہ تعالیٰ کی ان پیاری صفات یا اس پیاری صفت سے "آنے کی صفت سے" وہ یہ ہے:

1- کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے۔ جب انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آئے گا قیامت کے دن حساب کے لیے تو وہ ڈر جاتا ہے اور عظیم دن ہے قیامت کا دن جس میں اللہ تعالیٰ آئے گا اپنے بندوں کا حساب کرنے کے لیے۔

2- اور فرشتے بھی نازل ہوں گے۔

3- اور پھر جیسے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حساب کے لیے انسان کے ساتھ اکیلا "يَخْلُو بِهِ" اکیلا ہو جائے گا تو یہ بندہ اپنے دائیں طرف دیکھے گا پھر بائیں طرف دیکھے گا، صرف وہی دیکھے گا جو عمل وہ اپنے ساتھ لے کر آیا ہے، پھر اپنے سامنے دیکھے گا تو صرف جہنم اسے نظر آئے گی "فَاتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ"، اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں (کہ جہنم کی آگ سے بچو اگرچہ اللہ کے راستے میں کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ دے دو)۔

"شق تمرۃ" کہتے ہیں جب آپ کھجور کو توڑ کر آدھا آدھا کر دیتے ہیں اسے شق تمرۃ کہتے ہیں، اور یہ متفق علیہ حدیث ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے کیونکہ حساب کا وقت سب سے مشکل ترین وقت ہوگا۔

اور انسان اپنے دائیں طرف دیکھے گا دائیں بائیں کیوں دیکھ رہا ہے پتہ ہے ؟! کہیں کوئی اسے اچھا عمل نظر آ جائے نا اسے پتہ ہوگا کہ اس وقت عمل کام آئے گا۔ تو دائیں طرف دیکھے گا، بائیں طرف دیکھے گا کچھ بھی نہیں ہے اس کے اپنے اعمال ہوں گے۔ کوئی یار و مددگار ہے ؟ دائیں طرف کوئی نہیں بائیں طرف بھی کوئی نہیں، اپنے اعمال ہیں ! سامنے دیکھے گا جہنم ہے۔ "فَاتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ": یعنی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی اس دنیا میں حقیر مت سمجھو اگر آپ کے پاس پوری کھجور نہیں ہے دینے کے لیے اللہ کے راستے میں آدھی کھجور ہے وہ بھی دے دو پیچھے نہ رہو۔ یہی آدھی کھجور ہو سکتا ہے

کہ قیامت کے دن آپ کی گردن کی خلاصی ہو جائے اور آپ جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔ تو جہنم کی آگ سے بچنا ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں آدھی کھجور ہی دے دیں۔

اور ان چیزوں پر ایمان جو ہے یہ عظیم چیزیں ہیں جیسا کہ یہ جو اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے باب میں ہم ذکر کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے اور مومن جو ہے اس کے ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنے دین پر قائم رہے اور استقامت اسے حاصل ہوتی رہے۔((واللہ أعلم))۔

سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

یہ رسالہ ڈاکٹر مرتضیٰ بن بخش (حفظہ اللہ) کے آڈیو درس (38.العقيدة الواسطية) سے لیا گیا ہے۔
سبق لسانی اور تعبیر کی غلطی کو درست نہیں کیا گیا ہے۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر کوئی اور غلطی نظر آئے تو ضرور آگاہ کریں اور اس خیر کے کام میں شامل ہو جائیں۔